ڈاکٹر سعدیہ طاہر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر وزیر آغا اور تخلیقی عمل کے سرچشموں کی تلاش

Dr. Sadia Tahir
Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

Dr Wazir Agha and search of Origin of Creative Work

This essay is an attempt to understand, appreciate and evaluate the rare contribution of Dr. Wazir Agha towards understanding the nature and dynamic of creative process. In the course of this intellectual and psychological exploration Dr. Wazir Agha has used most modern methodology barrowed from various disciplines of social as well as natural sciences. I have tried to prove that Dr. Wazir Agha is the first and the only literary critic who has performed this marvelous job.

تخلیقی عمل ایک پُراسرار واردات ہے۔ سائنس وحکمت زمانۂ قدیم ہی سے عملِ تخلیق کے اسرار و رموز کی تلاش وجستجو میں سرگرداں چلی آ رہی ہے۔ سائنسی علوم کی روزافزوں ترقی اِس باب میں بھی نِت نئے انکشافات سے انسانی تجسس کی تسکین کا سامان کرنے میں مصروف ہے۔ اُردو ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُنھوں نے تخلیقی عمل کے اسرار کو منکشف کرنے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اُنھوں نے علم وحکمت کی تحصیل وترسیل کو عبادت کا درجہ دے کر خود کو ہر آن حقائقِ حیات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے۔ وہ ایک طویل عرصے تک قدیم وجدید علم وادب اور سائنس وحکمت سے بھی تخلیقی عمل کے بھید سمجھنے میں مصروف رہے اور کتابِ فطرت کے عمیق مشاہدے سے بھی۔ آیئے یہ دیکھیں کہ مشاہدۂ فطرت سے اُن کے ذہن پر تخلیقی عمل کی پہچان پہلے پہل کب اور کیسے طلوع ہوئی تھی؟ اپنی خودنوشت بعنوان ''شام کی مُنڈیر سے'' میں کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد کے اپنے معمولات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''میں صُبح پانچ بجے اُٹھتا، جلدی جلدی ناشتہ کر کے، فُل بُوٹ پہن کر، کھیتوں میں نکل جاتا جہاں لوگ پہلے سے موجود ہوتے۔ میں فیتا ہاتھ میں لیے، کھیتوں اور سڑکوں اور کھالوں کے بَل نکال نکال کر اُنھیں سیدھا کرنے کے عمل میں جُتا رہتا۔ نہ جانے مجھ میں اتنی سکت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں ۱۲۰ فارن ہائیٹ درجۂ حرات میں بھی، سَر پر سولا ہَیٹ رکھے، سارا سارا دن کھیتوں میں کام کرتا رہتا۔ جلد ہی الھڑ دھرتی کے نَین نقش سنورنے، پھر شوخ سے

شوخ تر ہونے لگے اور میرے قطعۂ زمین کے اندر سے زرعی فارم کی ہیئت لپک کر باہر آ گئی۔ انھیں دنوں، میں نے لاہور میں ایک بار، زوبی کو کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ چند روز ادبی دنیا کے دفتر میں بھی آتا رہا تاکہ مولانا صلاح الدین احمد کا مجسمہ بنا سکے۔ پہلے تو اُس کے ہاتھ، تادیر مٹی کے ایک بڑے سے گولے کو سہلاتے، تھپتھپاتے رہے اور پھر یکایک اُس گولے پر مولانا کے چہرے کے نقوش اُبھرنے لگے؛ اور دیکھتے ہی دیکھتے چکنی مٹی کا گولا، مولانا کے چہرے میں تبدیل ہو گیا۔ اُس وقت مجھے یوں لگا جیسے مولانا کا چہرہ مٹی کے گولے کے اندر کہیں موجود تھا؛ زوبی نے تو فقط فاضل مٹی کو ہٹا کر، مولانا کا چہرہ دریافت کر لیا تھا۔ تخلیقی عمل کے اس طریق کار نے مجھے بہت متاثر کیا اور ادب اور آرٹ کے سلسلے نے مجھ پر اس بات کو واضح کیا کہ فن کار کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا، وہ چیزوں کے مابین ایک نیا ربط دریافت کرتا ہے۔ کافی عرصے تک تخلیقی عمل کا یہ پیٹرن مجھ پر مسلط رہا لیکن ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ جب میں نے اپنی کتاب تخلیقی عمل لکھی تو عملِ تخلیق کا ایک بالکل نیا رُوپ مجھ پر منکشف ہوا۔ زمین کو ہیئت مہیا کرنے کے اس عمل میں مجھے محسوس ہوا کہ میرا قطعۂ زمین بھی مٹی کا ایک گولا ہی تو ہے اور میں بھی زوبی ہی کی طرح اُس زرعی فارم کو تلاش کر رہا ہوں جو نہ جانے کب سے اس کے اندر چھپا بیٹھا ہے!''(۱)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تجربات و مشاہدات سے تخلیقی عمل کی معرفت کے سفر کا آغاز جس انداز سے کیا تھا ہماری تنقید میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ البتہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی طویل نظم بعنوان ''یدِ بیضا'' میں تخلیقی واردات کے اسرار و رموز کو پہلی بار موضوعِ سخن بنایا گیا تھا۔ درج بالا اقتباس کی آخری سطروں نے میرے ذہن میں ''یدِ بیضا'' کا درج ذیل بند تازہ کر دیا ہے۔ تاثیر کے خیال میں سنگ تراش کا تیشہ سیاہ پتھر کی چٹان کے اندر پہلے سے موجود حسین پیکروں کے خد و خال کے اردگرد لپٹے ہوئے زائد پتھروں کو ہٹاتا چلا جاتا ہے اور ڈھلے ڈھلائے حسین پیکر آپ سے آپ نمودار ہوتے چلے آتے ہیں:

نمود سر بسر اظہار و کوہ کن یک تن
ہزار پیکرِ شیریں فسرد در رگِ سنگ

کسی نے مسندِ سنگِ سیہ پہ لی کروٹ
برنگ موج اُبھرنے لگے نشیب و فراز
کھلا ہے ضربتِ تیشہ سے اک دریچۂ سرخ
قطار بستہ ہیولے کھڑے ہیں محوِ نیاز
عمود ہمت و قوسِ نیاز و محورِ درد
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بے سرو دست
تنے کسے ہوئے سینے، بلند سر بدست

شکارِ ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں

میں کس کو ترک کروں کس کو انتخاب کروں

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ احساس کہ ''میرا قطعۂ زمین بھی مٹی کا ایک گولا ہی تو ہے اور میں بھی زوبی ہی کی طرح اُس زرعی فارم کو تلاش کر رہا ہوں جو نہ جانے کب سے اس کے اندر چھپا بیٹھا ہے!'' ڈاکٹر تاثیر کے اِس خیال کو آواز دیتا ہے کہ حسینائیں تو پتھر کی چٹان میں پہلے ہی سے موجود ہیں اور سنگ تراش کا فن زائد پتھر کو ہٹا کر اندر موجود حسیناؤں کو بے نقاب کر دینے کا نام ہے۔ ڈاکٹر تاثیر اور ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ مشترک احساس ہر دو فن کاروں کے تخلیقی ضمیر سے پھوٹا ہے۔ ہر دو شاعروں نے اپنے اپنے الگ الگ تجربات اور جداگانہ مشاہدات کے آئینے میں تخلیقی واردات کا عکس الگ الگ دیکھا ہے مگر یکساں نتائج تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنی زیرِ نظر نظم پر ایک مختصر سا نثری نوٹ بھی تحریر کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ:

''تخلیقِ شعر ایک پُر اسرار مگر قدرتی واردات ہے۔ یہ چند لوگوں کو ودیعت کی گئی ہے اور ان چند لوگوں کی زندگی کے چند لمحات ہی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ الہام۔ آمد۔ تخلیق جو نام تجویز کیجیے، مدّعا اسی عمل کی غیر شعوری کیفیت کو ظاہر کرنا ہے۔ مصوّری، سنگ تراشی، موسیقی، اَدب (ناول، شاعری) وغیرہ کا ایک ہی قبیلہ ہے مگر مختلف خاندان ہیں اور اختلاف کا یہ حال ہے کہ کئی طباع شاعر مصوّری سے بے ذوق ہوتے ہیں اور کئی مصوّر ادب سے بے بہرہ۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث میں بیشتر اُلجھنیں فنونِ جمیلہ کی تخلیقی واردات کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ فن کار کی اپنی زندگی کا منتہا تو فن ہی ہوتا ہے۔ یہ فکر غیر فنکار کو ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں فن کا کیا مقام ہو۔ فن کار کی زندگی فن ہے۔ اس کی زندگی ہی تلاش میں گزر جاتی ہے مگر تلاش کے لفظ میں شعوری ارادیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ آرزومندی، جستجو کی ارادیت جھلکتی ہے۔ تخلیقِ فن میں تلاشِ معاش کی سی تلاش نہیں ہوتی۔ زندگی کے عام کاروبار کی طرح اس میں بھی ایک طرح کی زحمت ہوتی ہے مگر اس کی جراحت، اس کی خراش مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ ذرا سی ایک جراحت بھی طرب ناک ہوتی ہے۔ خارجی اور داخلی دُنیا، نظر اور قلب کی دنیا کا مقامِ اِتّصال، فنکار کی شخصیت ہے۔ یہ آرٹ کا مقام ہے۔ مقام کا لفظ بھی استعارہ ہے۔ یہاں احساس کا تنوع بھی وحدت اختیار کر لیتا ہے۔ باہر اور اندر کی دنیا ایک ہو جاتی ہے۔ نگاہِ گوش کو نغمے دِکھائے جاتے ہیں۔''(۲)

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظم ''یدِ بیضا'' کا پہلا بند ایک مرتبہ پھر پڑھ لیا جائے:

مجھے تلاش رہی ہے

نہیں تلاش نہیں

تلاش میں تو طلب

جستجو سی ہوتی

دبی دبی ہی سہی

آرزو سی ہوتی ہے

نہ آرزو نہ طلب ہے نہ جستجو نہ تلاش
ذراسی ایک جراحت ذراسی ایک خراش

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اُس کا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اُس کا

جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہِ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

وہ طورِ جلوہ معنی
وہ کارگاہِ کمال

تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے باک وارداتِ جمال
ہوس نہ عشق نہ منزل نہ سرحدیں نہ حدود

جمال: تابشِ رُو، گرمیِ خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں

اب ایک بار پھر اس نظم کے ساتھ منسلک نثری نوٹ کی جانب مراجعت ضروری محسوس ہوتی ہے:

''اِس وارداتِ تخلیق کو مقامِ طور کہہ لیجئے لیکن یہاں کلامِ علم کے زور سے نہیں۔ یہ منطق کی گفتگو نہیں۔ خیال تصور سے پاک، واردات تعینات سے بیباک ہے۔ ہوس، عشق، یہ واردات کا مواد ہیں۔ عام موانعات کا یہاں اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر فن کا مقصد تخلیقِ جمال ہے تو یہ جمال محض مادی حُسن نہیں۔ فغانی نے، ع: بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست، صحیح کہا ہے۔ فنونِ جمیلہ کی دُنیا جمال واردات کی ترجمانی، مضمون اور اشیاء کی فہرست بنانے سے نہیں ہوسکتی۔ یہ تو کاروباری معانی سے آزاد، اشکال وتفہیمات کی دُنیا ہے، سوادِ قوس وخم و گردش نشور و سرور...... یہ وہی طور کا مقام ہے۔ وہاں الہامی کیفیت کیا تھی؟ ذاتی زندگی، مادی حالات، مظاہر قدرت کی حیثیت کچھ نہیں۔ طور اور موسیٰ دونوں غائب ہو گئے مگر تخلیقی عمل سنگتراش کا ہاتھ، مصوّر کا ہاتھ، شاعر کا معجز کار قلم، ایک دہکتا ہوا نشان، یدِ بیضا فقط اسی کا وجود مرکزِ واردات رہا۔ یہی حاصل تماشا ہے۔ فن کار کی زندگی یہی ہے۔ اس کی زندگی فن ہے اور فن اس کی زندگی ہے۔ ادب برائے ادب صحیح ہے کہ ادب زندگی ہے، ادب برائے زندگی صحیح ہے کہ زندگی ادب ہے۔''(۳)

ابن العربی اور رومی سے لے کر غالب، اقبال اور تاثیر تک ہمارے شاعروں نے تو کبھی کبھار تخلیقی عمل کے اسرار و رموز پر شاعرانہ سی نگاہ ڈالی ہے مگر سائنس وحکمت کی علمی فتوحات کی روشنی میں تجزیاتی اور تنقیدی نگاہ کو کام میں لا کر تخلیقی عمل کا انکشاف کرنا ہمارے ہاں فقط ڈاکٹر وزیر آغا کو نصیب ہوا ہے۔ بے شک غالب نے ہمیں بتا رکھا ہے کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اور بلاشبہ اقبال نے اپنی شاعرانہ پرواز کے دوران ''سرود'' کی سی نظمیں تخلیق کی ہیں جو سراسر سوال اندر سوال ہیں:

آیا کہاں سے نالۂ نَے میں سرودِ مے؟
اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے؟
دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟
کیوں اس کی اِک نگاہ اُلٹتی ہے تختِ کَے؟
کیوں اس کی زندگی سے اقوام کی حیات؟
کیوں اس کے واردات بدلتے ہے پے بہ پے؟
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہُنر ہیں طے!

غالب نے جس نوائے سروش کا ذکر کیا ہے اُس کی کیفیت و ماہیت کیا ہے؟ اور اقبال نے اپنی درج بالا نظم کے ایک ایک مصرعے میں جو سوالات اُٹھائے ہیں اُن کی سائنسی حقیقت کیا ہے؟ یہ تمام سوالات اب تک ہمارے ادبی آفاق پر ڈاکٹر وزیر آغا کے طلوع کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے شاعرانہ مزاج سے کہیں آگے بڑھ کر اس جستجو میں سائنسی صداقتوں کو سمجھا، پرکھا، آزمایا اور یوں تخلیقی عمل کی سی سائنسی دستاویز شائقین ادب وفن کے ہاتھ آئی۔ ہر چند ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ کتاب اب سے چالیس برس پیشتر شائع ہوئی تھی مگر ڈاکٹر صاحب موصوف کتاب کی اشاعت سے لے کر آج تک اِس موضوع پر جدید علوم کی روشنی میں مسلسل غور و فکر میں مصروف رہے ہیں۔ اِس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے اس غور و فکر کے ثمرات سے ادبی دُنیا کو مستفیض کرنے کی خاطر کتاب کے نئے ایڈیشنوں میں اضافے کا عمل جاری رکھا ہے۔ اُنہوں نے اس موضوع پر اپنے آخری مقالے کا آغاز درج ذیل الفاظ میں کیا تھا:

> ''تخلیقی عمل کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں سامنے آیا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں اس کے چھٹے ایڈیشن کے موقع پر میں نے تنقیدی تھیوری کے حوالے سے تخلیقی عمل کی ساخت کا جائزہ لینے کے لیے، اس میں ایک نئے باب بعنوان ''تیس سال بعد'' کا اضافہ کیا تھا۔ اب ۲۰۰۹ء میں جب اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن چھپنے کو ہے، مجھے مزید ایک باب شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ پس منظر اس طلب کا یہ ہے کہ جب میں نے آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے یہ کتاب لکھی تھی تو استقرائی عمل کی کارکردگی کا جائزہ لیا تھا۔ مقصود یہ جاننا تھا، کیا زندگی کے مختلف مظاہر کی بُنت میں ایک ہی وضع کا تخلیقی عمل کارفرما ہے کہ نہیں! سو میں نے سوسائٹی، اسطور، تاریخ اور فنونِ لطیفہ کے علاوہ، حیاتیات کے حوالے سے بھی تخلیقی عمل کی کارکردگی کو جاننے کی کوشش کی تھی؛ تاہم میں طبیعیات کے حوالے سے ایسا نہ کر سکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس وقت ابھی طبیعیات میں وہ پیش رفت نہیں ہوئی تھی جس سے کائنات کے تخلیقی عمل کے جملہ

مراحل واضح طور پر نظر آ سکتے۔ پچھلے چالیس سالوں کے دوران میں طبیعیات نے کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر میں اتنی دُور تک پیش قدمی کی ہے کہ اَب کائنات کے تخلیقی عمل کو ایک بڑی حد تک سمجھنا ممکن ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ طبیعیات کے حوالے سے بھی تخلیقی عمل کا جائزہ لینے کی کوشش کروں۔''(۴)

''تخلیقی عمل'' وزیر آغا کی ''اُردو شاعری کا مزاج'' کی طرح مقبول ترین کتاب ہے۔ وزیر آغا جدید نقادوں میں ایک اعلیٰ مقام کے حامل تھے اور تخلیق کے بارے میں اُن کے نظریات ہمیشہ سے الگ رہے ہیں۔ تخلیق کیوں کر ظہور پذیر ہوتی ہے؟ کن مراحل سے گزرتی ہے؟ اور یجنل تخلیق کی بنیاد کیا ہے؟ عام اور خاص تخلیق میں تفریق کیا ہے؟ اصل تخلیق کی شناخت کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اس کتاب کی زیریں بُنت میں ہمہ دم کارفرما ہے۔ وزیر آغا نے تخلیقی عمل کی کارکردگی کو اور اس کے وجود میں آنے کو کئی زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے یعنی تخلیقی عمل کا حیاتیاتی پہلو، تخلیق دائروی سفر کرتی ہے یا خطِ مستقیم میں تخلیقی عمل کا دیومالا سے تطابق، تخلیقی عمل میں تاریخ کا دخل، تخلیقی عمل فنونِ لطیفہ کی روشنی میں اور پھر ان تمام کہانیوں کا حاصل۔ اس کتاب میں ایک مضمون ''تین برس کے بعد'' کے نام سے شامل ہے۔ شاہد شیدائی کا کہنا کہ:

> ''تخلیقی عمل' وزیر آغا کی اہم ترین تنقیدی کتاب ہے جس میں اُنہوں نے استخراجی انداز اپنانے کے بجائے استقرائی عمل کی مدد سے اس موضوع کو سمجھنے اور سمجھانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وزیر آغا نے تخلیقی عمل کی ساخت...... حیاتیات، تہذیب وتمدن، اساطیر اور تاریخ کے مطالعہ سے مرتب کیا ہے اور پھر اس کے اطلاق فنونِ لطیفہ (رقص، موسیقی، مصوری، شاعری) پر کیا ہے تخلیقی عمل کے یہ تمام ابواب، اپنی الگ الگ حیثیت میں کہانیوں کی سی دلچسپی رکھتے ہیں اور آپس میں یوں مربوط ہیں کہ آخری باب رقم ہوتے ہی اس پر ناول کا گمان ہونے لگتا ہے۔''(۵)

وزیر آغا نے تخلیقی عمل کو وہ عمل قرار دیا ہے جس کی رو سے انسان اپنے ہی وجود کی بامشقت قید سے رہائی پاتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی شے کسی مدار میں مسلسل گھومتے چلے جانے کے بعد اچانک لپک کر ایک نئے اور کشادہ مدار میں چلی جائے۔ اُن کے نزدیک کائنات اور اس کے جملہ مظاہر اسی تخلیقی عمل کے زیرِ اثر ہیں وہ حقیقتِ اعلیٰ کو بھی دو سطحوں میں بانٹ کر واضح کرتے ہیں۔ ایک خود فراموشی کی سطح اور دوسری جہدِ مسلسل کی سطح۔ حقیقت کا شانت روپ سے جوالامکھی روپ میں ظہور پذیر ہونا دراصل اس کا تخلیقی عمل ہے اسی طرح نظریہ جبر وقدر کے درمیاں ایمان اور پھر اس پر سے ایمان اُٹھنے کے عمل کو بھی تخلیقی عمل قرار دیتے ہیں اور اسے ایک مدار سے دوسرے مدار میں جانے کا نام دیتے ہیں اور قدیم رشتوں کے ٹوٹنے سے نئے رشتوں کا وجود میں آنا بھی تخلیقی عمل کے تابع ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حیاتیاتی پہلو کی ابتدائی سطح بے حد سادہ ہوتی ہے جیسے امیبا کو کاٹنے سے دو زندہ حصوں میں بٹ جاتا ہے تو اس کی دوسری صورت پیوند ہوتی ہے اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ بیضہ اور تخلیقی جرثومے کے عمل میں بیضہ تخلیقی جرثومے کی آمد سے پہلے بے حس وحرکت ہوتا ہے لیکن تخلیقی جرثومے کی آمد کے بعد وہ ایک رقیق اور بے ہیئتی میں بدل جاتا ہے۔ اس کے بدلتے ہی اس کا ارتقاء شروع ہو جاتا ہے جسے وزیر آغا جست کہتے ہیں۔ وزیر آغا تخلیقی عمل کے حیاتیاتی پہلو پر تفصیل سے بات کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''حیاتیات میں ایک نسل کے اندر سے ایک بالکل نئی نسل کی نمود کے اس عمل کو تقلیب (Mutation) کا نام ملا ہے۔ دراصل تقلیب، خلیے کے اندر کروموسومز کی ایک انقلابی تبدیلی سے نمودار ہوتی ہے اور یہ انقلابی تبدیلی

ہمیشہ کسی داخلی عمل کے تحت وجود میں آتی ہے۔مثلاً جب امیوبا سے حیوان یا حیوان سے انسان نے جنم لیا تو یہ ارتقاء کے سلسلے میں تقلیب ہی کی ایک صورت تھی جبکہ امیوبا کا امیوبا کو پیدا کرنا، حیوان کا اپنے جیسے حیوان کو جنم دینا اور انسان کا اپنی وضع کے انسان کو وجود میں لانا تخلیقی مکرر عمل تھا جسے زیادہ سے زیادہ تخلیقی عمل کی نقالی کا نام دیا جاسکتا ہے۔'' (۶)

کتاب کے دوسرے باب میں تخلیقی عمل کو دائرہ اور خط مستقیم کے تناظر میں دیکھا ہے۔ان کا مؤقف یہ ہے کہ تخلیقی عمل موجود کی زنجیروں اور حد بندیوں کو توڑ کر از سرِ نو جنم لینے کا نام ہے۔وہ کہتے ہیں کہ معاشرہ ایک کل ہے اور فرد جزو اور فرد کی بقا اسی میں ہے کہ وہ کل کے پروں تلے اپنی زندگی گزار دے۔دوسرا نظریہ یہ ہے کہ فرد آزاد پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کی قید و بند کو برداشت نہیں کرتا۔انہوں نے ان نظریات کا قدیم و جدید نظریات کے تناظر میں تجزیہ کیا۔انسان کی جنگلی حیات کو دائرے کی گہری لکیر قرار دیا۔جب اس نے زرعی دور میں قدم رکھا تو درخت کی بجائے بیج کو اہمیت دی۔وہ اس سلسلے میں قدیم دیومالا، فیثا غورث، افلاطون اور رگ وید کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

وہ معاشرے کو ایک زندان ثابت کرتے ہیں جس پر مذہب کی چھاپ گہری ہے۔ان کا کہنا ہے کہ معاشرہ پرانے پتھر کے زمانے سے راکٹ کے دور تک جا پہنچا ہے تو یہ سب ایسی مختلف تخلیقی جستوں کا ہی کرشمہ ہے اور بالخصوص یہ تخلیقی جستیں خلاق ہستیوں کی مرہونِ منت ہیں۔وہ رقمطراز ہیں کہ:

''حقیقت کا بنیادی وصف دائروں کی صورت میں کشادہ سے کشادہ تر ہوتے چلا جاتا ہے اور یہ کہ جب وہ ایک مدار سے دوسرے مدار میں جاتی ہے تو لازمی طور پر ایک تخلیقی جست (Creative Jump) کی مدد سے ایسا کرتی ہے۔تو ناظر کو حقیقت کا ایک ایسا روپ نظر آتا ہے جو دائرے اور خطِ مستقیم دونوں کو اپنے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔'' (۷)

اُنھوں نے تخلیقی عمل کے ضمن میں اسطورہ یا متھ (Mith) سے اگلے باب میں تفصیلی بحث کی ہے۔اس حوالے سے مذہب الارواح کا خصوصی طور پر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ تخلیقی کائنات کے بارے میں تقریباً تمام اسطیر متفق ہیں۔مثلاً ''پرانا عہد نامہ''، ''ویدک'' کے ساتھ ساتھ تخلیقی کائنات کے تصور پر جغرافیائی اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔بابل، نینوا کی تہذیبوں میں مماثلت کو بھی نشان زد کرتے ہیں اور متھ (Mith) کی مختلف کتابوں میں مماثل ہونے پر بھی مدلل گفتگو کرتے ہوئے ان کہانیوں کی زیریں سطح پر مماثلت کو تخلیقی عمل کا عطر قرار دیتے ہیں اور تخلیقی جست کے ذریعے انسان کا خود کو کشادہ تر اور ارفع تر کر لینے کو ازلی اور ابدی حقیقت قرار دیتے ہیں۔وزیر آغا نے جس طرح پہلے باب میں تخلیقی جست یا زقند کا ذکر کیا ہے دوسرے باب میں بھی اسی طرح روا رکھا ہے۔

کتاب کا اگلا باب ''تاریخ کا تخلیقی عمل'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے جس میں تغیر، تنوع اور ارتقاء کو تاریخ کا بنیادی وصف قرار دیتے ہیں جس کے تحت ماضی کو قدیم اور حال کو انوکھا ثابت کرتے ہیں۔اُن کے اپنے الفاظ میں:

''جب تہذیب کسی وجہ سے رک کر دائرے میں گھومنے لگتی ہے تو تاریخ کے عمل سے منقطع ہو کر ماضی کی تابع مہمل ہو جاتی ہے۔(جبر) مگر جب وہ دائرے سے باہر آ کر ایک نیا مدار پیدا کرتی ہے (قدر) تو ایک ایسے منفرد تخلیقی عمل کا

مظاہرہ کرنے لگتی ہے، جو اپنے حرکی عناصر سے تاریخ کو جنبش میں لانے کا باعث ہوتا ہے (حیاتیات نے اسے تقلیب کا نام دیا ہے)۔''(۸)

وزیر آغا تاریخ کو محض واقعات کا ڈھیر نہیں جانتے بلکہ ان واقعات کے عقب میں اس تناظر کو اہمیت دیتے ہیں جن کی وجہ سے یہ رونما ہوئے۔ اس ضمن میں دلائل کے طور پر شیلنگ، نٹشے، ہیگل کے خیالات کو بروئے کار لاتے ہیں اور تاریخ کے اصل کی شپنگلر کے اقوال کی روشنی میں توضیح کرتے ہیں۔ اس پر مزید بات کرتے ہوئے آگسٹائن موری البیادی، جوچم کے علاوہ مسلمان مفکر ابنِ خلدون کے مقدمے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہیگل اور مارکس، ٹائن بی، پیٹر گئیل کے عمل دخل کو بھی اس بحث کا حصہ بناتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں تاریخ کے عمل دخل کو اس اقتباس میں وضاحت سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بالکل یہی کیفیت، تاریخ کے تخلیقی عمل کی بھی ہے کہ وہ نہ صرف خود کو جست کے ذریعے ظاہر کرتا ہے بلکہ ایک سابقہ جہان کے انہدام کا منظر بھی دکھاتا ہے۔ غور کیجیے پانچویں سے آٹھویں صدی قبل مسیح تک کے تخلیقی اُبال سے پہلے ایک تاریک دور (The dark age) آیا تھا جو کئی سو برس تک جاری رہا تھا اور جس میں سابقہ تمام تہذیبیں، انحطاط پذیر ہو گئی تھیں۔ مگر اس ''تاریک دور'' سے ذرا پہلے مختلف تہذیبیں اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد عافیت اور امن کے اثمار سے بہرہ اندوز ہو بھی چکی تھیں۔ مثلاً مشرقِ وسطیٰ کی دو حریف مصریوں اور حطّیوں کی سلطنت میں بھائی چارے اور مفاہمت کی فضا پیدا ہو چکی تھی، اس حد تک کہ مصر کے بادشاہ، رعمی سیز (Ramesses) نے ایک حطّی شہزادی سے شادی بھی کر لی تھی۔ اس طرح کریٹ اور یونان میں مائی سی نیایوں (myceneans) نے قدیم منوان (Minoan) تہذیب کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب کھڑی کر لی تھی۔ پھر اُن کا تسلط، سارے مشرقی بحیرۂ روم کے علاقے تک پھیل گیا اور اُنہوں نے متعدد جزائر میں اپنی نوآبادیات قائم کر لی تھیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو شہرت و تمکنت کے متمنی اور شخصی وقار کے قائل تھے اور جن کا ذکر ہومر نے الیڈ (Illiad) اور اوڈیسی (Odyssy) میں کیا۔ بابل میں سامی النسل لوگوں نے حمورابی کے زیرِ نگیں ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی اور ایک متوازن خوش باش زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ ہندوستان میں وادئ سندھ کی تہذیب، اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی، ہر چند اس میں پہلی سی توانائی باقی نہیں رہی تھی تاہم یہ ایک خاص پرسکون اور منظّم معاشرہ تھا۔ چین میں شانگ (Shang) کی حکومت قائم تھی (بعد ازاں چاؤ سلطنت نے اس کی جگہ لے لی اور ایک انتہائی مربوط معاشرتی، سیاسی اور مذہبی فضا قائم کر دی)۔ گویا مہذب دُنیا کے طول و عرض میں یہ ایک ٹھہرا ہوا پُرسکون دور تھا۔ جس میں انسان تہذیب کے اثمار سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا اور یہ تصور کرنا ممکن ہی نہیں تھا کہ آناً فاناً تہذیب کے یہ مظاہر، زوال پذیر ہو جائیں گے اور ''تاریک دور'' اُنہیں اپنی لپیٹ میں لے گا۔ تاہم ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ اس سارے خطۂ زمیں پر، وہ صورتِ حال نمودار ہو گئی جس کے لیے بہترین لفظ ''نراج'' ہے اور جو ہر تخلیقی زقند سے ذرا پہلے وارد ہوتا ہے۔''(۹)

فنونِ لطیفہ میں تخلیقی عمل کی کارفرمائی کے موضوع پر کتاب کے آخری باب میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے حیاتی، سماجی،

اساطیری، تہذیبی اور کئی دوسری سطحوں پر تخلیقی عمل کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر باب میں تخلیقی عمل کو فنونِ لطیفہ کی روشنی میں ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق فنونِ لطیفہ کی تخلیق میں ابتدائے آفرینش سے جو محرکات کارفرما رہے ہیں اُن میں سب سے زیادہ پُراسرار محرک Rhythm ہے جسے آہنگ کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ یہ آہنگ بھی دو درجوں میں منقسم ہے، پہلا حرکت ہے، دوسرا سکون کا۔ ان دونوں کے امتزاج سے آہنگ ترتیب پاتا ہے۔ علاوہ ازیں تخلیقی واردات کے دوران تخلیق کار ہمیشہ دو دنیاؤں کے سنگم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایک دنیا اس کے لیے اجتماعی لاشعور سے جنم لیتی ہے جبکہ دوسری دنیا وہ ہے جس میں تخلیق کار سانس لیتا ہے۔

اس حوالے سے کینتھ برک، یونگ اور ہربرٹ ریڈ کے نظریات سے دلائل پیش کیے ہیں۔ نتیجۃً تخلیقِ فن کی بنیاد کو چار کردار ترتیب دیتے ہیں یعنی اجتماعی لاشعور، معروضی دنیا، تخلیقی مشین اور آہنگ ان کی مدد سے یہ سارا ڈرامہ تخلیق کار کی ذات کے اندر کھیلا جاتا ہے۔ لیکن جب تک داخلی آہنگ متحرک نہیں ہوتا تب تک خارجی آہنگ کا وقوع پذیر ہونا بعید از قیاس ہے۔ وزیر آغا کے نزدیک یہ چار عناصر تخلیقی حس کو مہمیز لگاتے ہیں۔ رقص کو سب سے قدیم فن قرار دیتے ہیں۔ قبائلی ناچ کو مزاجاً اجتماعی رقص کی ایک صورت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ رقص کی زبان جسم ہے اور جسم کورے برتن کی طرح ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ وہ رنگ، پتھر اور لفظ کے مقابلے میں جسم کو ایک کمزور وسیلہ جانتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ رقص کی لطافت، رفعت اور جذبے کی تہذیب کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اس بات کے لیے وہ جدید اُردو شاعری میں سے ن م راشد کی نظم ''اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے''، یوسف ظفر کی نظم ''رقص'' اور قیوم نظر کی نظم ''ناچ'' کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے رقص کی حقیقت آشکار کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک انسانی جسم آہنگ سے آشنا ہو تو رقص جنم لیتا ہے اور آہنگ آواز کا پیش رو ہے آواز روشنی سے پہلے برانگیخت ہوتی ہے۔ روشنی زندگی اور کائنات کو سمت اور حرکت سے آشنا کرتی ہے۔ کسبِ نور کا احساس دلاتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ فن قلبِ ماہیت کی ایک صورت مگر یہ قلبِ ماہیت ہمیشہ تہذیبِ نفس پر منتج ہوتی ہے۔ موسیقی کسی خاص شخص کے جذبات کا اظہار نہیں بلکہ یہ جذبات کا ایسا اظہار ہے جو ہزار صورتیں اختیار کرنے پر قادر ہے۔ آہنگ کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ’آہنگ، تصویر کے جملہ خطوط (Lines)، رنگوں (Colors)، خارجی صورتوں (Masses)، مکانیت (Spaces) اور روشنیوں (Lights) کا وہ اجتماع ہے جو اکائی کے تصور کو وجود میں لاتا ہے۔ نیز وہ تصویر کے کسی ایک حصے پر زیادہ دیر تک مرتکز نہیں رہنے پاتی۔ یہی آہنگ، تصویر کو وہ سکون، تناسب اور ٹھہراؤ بھی بخشتا ہے جو تصویر کے مختلف اجزا کی مکمل ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے۔''(۱۰)

وزیر آغا کے مطابق موسیقی کے برعکس دیگر فنون مثلاً کوزہ گری، مجسمہ سازی اور مصوری میں آہنگ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ آہنگ تصویر کی مکانیت، خارجی صورتوں، رنگوں، جملہ خطوط اور روشنیوں کا وہ مجموعہ ہے جو اس کو اکائی بنا دیتا ہے۔ جب یہ اکائی مصور کی ذات کے اندر تحلیل ہو کر تخلیقی جست کے لیے کچا مواد فراہم کرتی ہے تو تخلیق کا آمیزہ تیار ہونے لگتا ہے۔ وزیر آغا گراہم ویلس کے تخلیقی عمل پر دیے گئے نظریے پر اتفاق کرتے ہوئے اس کے چار مدارج کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

پہلا درجہ وہ ہے جس میں تخلیق کار کسی مسئلہ سے متعلق حتی المقدور معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ دوسرا درجہ پرورش کا ہے جس میں وہ ناکامی سے بیزار ہو کر تخلیقی عمل سے دست کش ہو جاتا ہے۔ تیسرا درجہ تنویر کا ہے جس میں وہ خیال جو تخلیق کار کے باطن میں بے صورتی کی حالت میں موجزن ہوتا ہے اچانک کسی صورت میں سامنے آتا ہے۔ چوتھا درجہ تصدیق کا ہے جس میں فن کار تخلیق کی کانٹ چھانٹ اور

نوک پلک سنوارتا ہے۔اس ضمن میں کالرج، شیلے، ورڈز ورتھ، ہربرٹ زیڈ، ڈرائیڈن ،فرائیڈ، ایڈلر، اقبال اور غالب کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیقی عمل کی ایسی توضیح پیش کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے یعنی تخلیقی عمل کی جملہ جہات کو اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ عام قاری بھی اس پر آسانی سے اپروچ اور تفہیم کرسکتا ہے۔ وزیر آغا نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مذکورہ بالا مفکرین کی آرا کو نشان زد بھی کیا ہے۔اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

''بعض کے ہاں خود فراموشی یا مزاج کی حالت کا ذکر نسبتاً زیادہ ہے اور بعض کے ہاں تخلیقی جست یا آہنگ سے لمس کی کیفیت زیادہ اہم قرار پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعراء سے کسی ایک کا تاثر بھی تخلیق کے سارے عمل کا احاطہ نہیں کرتا۔ احاطہ کرنا تو جبھی ممکن ہے کہ جملہ تاثرات کو اُن کے صحیح مقامات پر فائز کر کے تخلیقی عمل کی مختلف تدریجات پر مشتمل، ایک پوری تصویر یا ساخت کو نظر کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے ورنہ کسی ایک تاثر کو تمام تر اہمیت تفویض کرنے سے تخلیقی عمل کی زیادہ سے زیادہ ایک ادھوری جھلک ہی حاصل ہوسکتی ہے۔''(۱۱)

وزیر آغا کے نزدیک ہر شخص تخلیق کار کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا بلکہ تخلیق کار وہ ہے جسے قدرت کی طرف سے تخلیقی اوصاف ودیعت ہوتے ہیں۔انہوں نے تخلیق کار کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے تخلیقی عمل کے جملہ مراحل اور مدارج کا ذکر بھی کیا ہے اور فعال اور منفعل تجربات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ تخلیق کو ایک امتحان کے مترادف جانتے ہیں اور وہ امتحان تین مراحل پر مشتمل دکھاتے ہیں۔ پہلا مرحلہ طوفان کا ہے جب ذات کے اندر تصادم کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسرا مرحلہ مزاج کا ہے جب فن کار پر بے ہیئتی کا تسلط قائم ہوجاتا ہے اور تیسرا مرحلہ جست کا ہے جب فن کار vision، آہنگ اور میڈیم کو بیک وقت بروئے کار لا کر بے ہیئتی کو ہیئت مہیا کرتا ہے اور ایسا کر کے خود کو سانس رکنے کی کرب ناک کیفیت سے نجات دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وزیر آغا نے قاری یا تنقید نگار کی بھی وضاحت کی ہے۔تنقید کو وہ تخلیق مکرر قرار دیتے ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات، کتاب کی اشاعت سے تیس برس بعد رقم کیے گئے ہیں جو پچھلے ابواب کا ایک طرح سے خلاصہ بھی ہیں اور ان کے (نئے) تخلیقی عمل کے بارے میں مزید وسعت نظر کا حاصل بھی ہیں۔ چونکہ پہلے انہوں نے تخلیقی عمل کے معروضی حصے کو تفصیل سے بیان کیا ہے جہاں وہ تخلیقی عمل کے لیے حیاتیات معاشرہ متھ (Mith) اور تاریخ کو ضروری سمجھتے تھے۔ تیس سال بعد تخلیقی عمل میں حصہ لینے والے تین کرداروں کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے نزدیک وہ تین کردار تخلیق کار، قاری اور تخلیق ہیں۔ اس مثلث کے ذریعے انہوں نے تخلیق کے بارے میں بالکل نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ فنکار، قاری اور فنی تخلیق میں سے ہر شے کو الگ الگ پہچان دینے میں بجا طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''تخلیق کار ایک کاریگر کی طرح کچے مواد سے کوئی نئی اور انوکھی چیز بناتا ہے جس کی قیمت کا تعین اس کا قاری یا صارف کرتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کار اولاد کی تخلیق کا رشتہ وہ نہیں جو ایک کاریگر اور اس کی تخلیق کردہ شے میں ہوتا ہے وہ رشتہ ہے جو گرائمر یا لسانی سسٹم کا تحریر سے ہوتا ہے......قاری باہر کی کوئی ہستی نہیں تخلیق کار ہی کا منقلب روپ ہے اس کا سب سے بڑا کام اس زخم کو باقی رکھنا ہے جو تخلیقی عمل کے پہلے ہی وار سے حقیقت کے بدن پر لگا تھا۔''(۱۲)

انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر کے تناظر میں وزیر آغا تخلیقی عمل کے سب سے اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہی اصل نکتہ ہے کہ ہر بار جب عدم سے وجود کا ظہور ہوتا ہے وہ پہلے وجود سے ارفع تر ہوتا ہے'' (صفحہ: ۶۷)۔ گویا تخلیقی عمل زندگی

کی تجدید سے عبارت ہے۔اُن کے خیال میں ''ہر تخلیقی عمل حقیقت کے ایک نئے پرت کو سامنے لاتا ہے'' اور اس سے ''ہمیشہ ایک نئی حقیقت طلوع ہوتی ہے''(صفحہ ۸۶)۔زیرِ نظر موضوع سے ڈاکٹر وزیر آغا کے سائنسی ،فکری اور ادبی شغف کی گہرائی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''تخلیقی عمل'' کے چھٹے ایڈیشن کے بعد بھی اُنہوں نے ''تخلیقی عمل تکوینِ کائنات کے حوالے سے'' ایک انتہائی بصیرت افروز مقالہ سپرِدِقلم کیا ہے جس کی شمولیت کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں متوقع ہے۔اِس مقالے میں علمِ طبیعیات کے تازہ ترین نظریات کی روشنی میں تخلیقی عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس مقالے کے اختتامی پیراگراف کی ابتدائی سطور تازہ ترین سائنسی انکشافات کے تناظر میں تکوینِ کائنات کے عمل کو یوں پیش کیا گیا ہے:

> ''اَب تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ کالی شکتی یعنی Dark Energy کے متلاطم سمندر سے ہمہ وقت مختلف اَبعاد کے حامل برین،غباروں کی طرح پُھولتے ہیں اور اپنی اپنی کائنات کو وجود میں لاتے ہیں۔بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان میں سے ہر کائنات Cyclic ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک معین عرصے کے بعد اُس مقام پر لوٹ آتی ہے جہاں سے اُس نے پُھولنا شروع کیا تھا مگر اس دوران میں مزید کائناتیں،غباروں یا بلبلوں کی طرح پھول رہی ہوتی ہیں۔گویا ملٹی وَرس کے اندر تو کائناتیں پھولتی اور سکڑتی رہتی ہیں یعنی ان میں سے ہر کائنات کی ازل بھی ہے اور ابد بھی؛ مگر پورے ملٹی ورس کی کوئی ازل یا ابد نہیں،یعنی ملٹی ورس ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔مگر سوال یہ ہے، کیا ہم Ultra Microsocopic Level کو ملٹی ورس کی آخری حد قرار دے سکتے ہیں؟''**(۱۳)**

اِس سوال کے جواب کی تلاش وزیر آغا کو خالقِ اکبر کی پہچان عطا کرتی ہے۔اِس حقیقت کا اعتراف وہ اِسی پیراگراف کی اختتامی سطروں میں کرتے ہیں:

> ''اِس سلسلے میں سائنس دان تیقّن سے کچھ نہیں کہہ رہے؛ تاہم بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ ''اصل حقیقت'' کا محض ایک پرت ہو!ایسی صورت میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ طبیعیات، مابعدالطبیعیات میں ضم ہوکر، اُس عظیم ترین حقیقت کا اقرار کرنے لگی ہے جو تمام قوتوں اور تمام تر اجزا کو اپنی بے نہایت کشش کے ہالے میں سمیٹے ہوئے ہے اور جو تخلیقی عمل کا منبع اور مصدر ہے۔''**(۱۴)**

خالقِ اکبر کی ہستی کے اِس سائنسی اثبات کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کا سائنسی اور فکری تجسس ایک نئے مدار میں داخل ہو گیا تھا۔تخلیقی عمل کے موضوع پر اُن کا ایک اور مقالہ بعنوان ''تخلیقِ عمل......اقبال کے حوالے سے'' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ہر چند اس مقالے کو پڑھتے ہوئے مجھے علامہ اقبال اور ڈاکٹر وزیر آغا کے فکری سرچشمے مشترک نظر آئے تاہم اس موضوع پر میں آئندہ کبھی اظہارِ خیال کروں گی۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی مُنڈیر سے، لاہور، ۲۰۰۹ء، صفحات ۹۱۔۹۲

۲۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، آتشکدہ، لاہور، سن ندارد، صفحات ۴۔۵

۳۔ ایضاً، صفحات ۱۔۲

۴۔ کاغذی پیرہن، لاہور، نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء، صفحہ ۱۵

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، فلیپ، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء

٦۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، چھٹا ایڈیشن، لاہور، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۵۳

۷۔ ایضاً، صفحہ ۵٦

۸۔ ایضاً، صفحہ ۹۴

۹۔ ایضاً، صفحہ ۹۷

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۷

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۷

۱۲۔ ایضاً، صفحات: ۱۹۰۔۱۹۱

۱۳۔ کاغذی پیرہن، لاہور، نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء، صفحہ ۱۷

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۱